Vol. 7 No.1 2024

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7615

اطرافِ اقبال: ملک حسن اختر کی نظر میں

Atraf e Iqbal: In the view of Malik Hassan Akhtar

***ڈاکٹر فوزیہ شہزادی**

سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، شاہدرہ لاہور

****ڈاکٹر وقار سلیم رانا**

سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، سمن آباد، فیصل آباد

*****عاطف منظور**

لیکچرر اُردو (وزٹینگ)، ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

******ڈاکٹر محمد امجد عابد**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract:

Allama Iqbal's name is prominent in the list of writers who gained fame through their services in the world of literature. Allama Iqbal, through his poetry, gave a manifesto to the whole world in which the eternal message of human welfare is hidden. Many critics, researchers, and scholars have written works on Iqbal, covering his valuable services. Malik Hasan Akhtar is one of Iqbal's scholars and has written five books on Iqbal and his thoughts. Among them, اطراف اقبال is his most notable work. In which he has shed light on Iqbal's life conditions and his various philosophies. The authors have presented a critical review of his work in this research article.

Keywords: Self, Tranced, Ishq, Education, Philosophy, Communism, Consciousnes, Ego, Lyric

کلیدی الفاظ: خودی، بے خودی، عشق، تعلیم، فلسفہ، اشتراکیت، شعور، انا، غزل

ملک حسن اختر نے علامہ کی زندگی کے حالات، فکر و فن اور دیگر متعلق موضوعات پر پانچ کتب لکھیں۔ یہ کتب ان کی اقبال شناسی کے حوالے سے ایک ایسی تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے جو تاریخ ادب و تنقید میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اقبال شناسی کے حوالے سے ملک حسن اختر کی پہلی کتاب ''اطرافِ اقبال'' ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲ء کو شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب میری لائبریری لاہور نے مناسب گیٹ اپ کے ساتھ شائع کی۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے امی اور ابا کے نام کیا ہے۔ حسن اختر نے اس کتاب میں علامہ اقبالؒ کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے موضوعات شاعری کو اپنی تحریروں کا عنوان بنایا ہے۔ ''اطرافِ اقبال'' حقیقت

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

میں اقبال کے فکر و فن کی مختلف جہات ہیں جنھیں بڑے سلیقے سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ فہرست کے مطابق ''اطرافِ اقبال''میں درج ذیل موضوعات شامل ہیں۔ مختصر حالاتِ زندگی، شاعرِ رنگیں نوا، دیدۂ بینائے قوم، فلسفۂ خودی اور بے خودی، تصورِ عشق، مردِ مومن، نظریۂ فن، تصورِ تعلیم، تصورِ ابلیس، اقبال اور سوشل ازم، اُردو غزل۔ ملک حسن اختر ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال بہت بڑا شاعر ہے اور اس کی بڑائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اُردو ادب کو تقریباً ہر پہلو سے متاثر کیا ہے۔ اقبال کے مخالف بھی اس کے اثر سے بچ نہیں سکے اور ان کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو موجود ہے۔ اقبال کی شہرت کا آغاز بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا۔ اور یہ اس وقت سے بڑھتی رہی ہے۔ اس وقت جبکہ اس صدی کا تین چوتھائی حصہ گزرنے کو ہے اس کی شہرت کا خورشید پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے......اقبال لان جائی نس کے تعمیر کردہ رفعت کے بلند بام پر جلوہ گر ہے۔ لان جائی نس نے عظیم ادب کی یہ پہچان بتائی تھی کہ وہ مسرت پہنچائے اور سب کو مسرت پہنچائے۔''۱

ملک حسن اختر نے اپنی رائے میں اقبال کے افکار کو لان جائی نس کے ''نظریۂ ترفع'' کے پس منظر میں دیکھ کر دونوں کی فکری مشابہت اور مماثلت کا ذکر کیا ہے۔ اس تحریر میں انھوں نے مثال دے کر اور تقابل کر کے اقبال کی بلند فکری کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے آگے چل کر ''اطرافِ اقبال'' کی اشاعت کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''ہم نے اقبال کی شاعری کو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور آئندہ زمانے کا نقاد ان کو اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں دیکھے گا...... اس کتاب میں سترہ عنوانات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اور اس طرح اُمید ہے کہ اقبال کی شاعری اور زندگی کے اہم پہلو سامنے آجائیں گے۔ پانچ مضامین اقبال کی نظموں کے مطالعے کے لیے وقف کیے گئے ہیں تاکہ طلباء کے لیے وقف کیے گئے ہیں تاکہ طلباء کے لیے کتاب زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔ آخر میں اقبال کے متعلق مشاہیر کے اقوال بھی الگ باب میں نقل کر دیے ہیں۔'' ۲

اقبالیات کے حوالے سے ملک حسن اختر کی متعدد کاوشوں میں اقبال کے فلسفیانہ نظریات بیان کیے گئے ہیں اور اُن کی تشریح اس انداز میں کی گئی ہے جو اقبال فہمی میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اُن کی شاعری کا بنیادی جزو ہے۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اس معنی میں ہے کہ وہ کلی تصور حیات پیش کرتا ہے اس کا موضوع فرد اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم تمدن کہہ سکتے ہیں۔ اقبال جس کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تمدن و فلسفہ پر عبور رکھتی ہے۔ اقبال کے ہاں خودی کا مفہوم محض انسان کی ذات یا روح ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے خطبات میں انسان کو محدود خودی اور خدا کو لامحدود خودی کہا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اسی طرح اس کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے۔ خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لیے نئے مقاصد متعین کرتا ہے۔ انھیں حاصل کرنے میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشکل ہوتی جاتی ہے۔ شاعر کی چشم تخیل انسان کے جدوجہد عمل کے لیے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

خودی کی غیر محدود قوت، تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے۔خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لیے توسیع کے ساتھ اس کی تادیب و ترتیب بھی ضروری ہے۔بے قید اور بے ترتیب خودی کی مثال شیطان ہے۔ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ''اصل کام خودی کو پیدا کرنا اور اس سے کام لینا ہے۔جس کی خودی جتنی بیدار ہو گی وہ اتنا ہی اعلیٰ مرتبہ کا حامل ہو گا۔جب خودی بیدار ہو جائے تو اس سے نیک کام لینا اور اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے بروئے کار لانا اعلیٰ ترین مقصد ہے ورنہ خودی کی قوت سے کام لے کر انسانیت کو نقصان بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔چنانچہ اسلام نے خودی کی حدود متعین کی ہیں تاکہ وہ قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے۔'' ۸

علامہ اقبال نے خودی کی تربیت کے لیے تین مراحل تجویز کیے ہیں تاکہ اسے بیدار کر کے قانون الٰہی کا پابند بنایا جائے وہ تین مراحل یہ ہیں۔

۱۔ خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت

۲۔ ضبطِ نفس

۳۔ نیابتِ الٰہی

خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت تب ہی ممکن ہے جب انسان ضبطِ نفس سے کام لے کر اپنی بُری خواہشات کو قابو میں کرے اور نیک خواہشات کو آگے بڑھائے۔

خودی وحدت وجدانی ہے یا دوسرے لفظوں میں شعور کا روشن نقطہ ہے۔وجدان اور شعور میں تھوڑا سا فرق ہے۔وہ یہ کہ وجدان ایک شیر خوار بچہ میں بھی موجود ہوتا ہے لیکن شعور بعد میں رونما ہوتا ہے اور عمر کے ساتھ ترقی کرتا ہے۔خودی وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسان تخیلات و جذبات سے مستفید ہوتے ہیں۔یہ پُر اسرار شے جو فطرتِ انسانی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔یہ خودی یا انا یا میں جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی کرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ذات یا خودی انفرادیت سے علیحدہ ہے، پتھر اور درخت میں انفرادیت ہوتی ہے، لیکن وہ خودی کے جوہر سے محروم ہوتے ہیں۔خودی روحانی شے ہے جس کی تعمیر سعی و جدو جہد کے بغیر ممکن نہیں۔سعی و جدو جہد کا نتیجہ ہے غم۔اس غم سے خودی کی وحدت پیدا ہوتی ہے جو ہر تغیر میں برقرار رہتی ہے۔اس وحدت کی بدولت وہ ہر اس کشاکش کو برداشت کر لیتی ہے جو عالم فطرت یا عالمِ عمرانی کی موافقت سے پیدا ہوتی ہے۔خودی کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ روح نے مادے پر فتح حاصل کر لی۔فطرت میں ارتقا ہوتا ہے لیکن خودی تخلیق کرتی ہے۔خودی انسان کی اندرونی زندگی کو بجائے جبر کے آزادی سے آشنا کرتی ہے۔

اقبال کا تصور خودی اور بے خودی ایک دوسرے سے مربوط بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔اقبال کے تصور فرد و ملت ایک دوسری سے جدا نہیں۔اقبال کے نزدیک فرد اپنے اعمال کا بذاتِ خود بھی محافظ اور ذمہ دار ہے اور اجتماع کا باشعور حصہ بن کر وہ اجتماع کے مقاصد کا محافظ و معاون ہے اور اپنی خودی کو اجتماع کی بے خودی سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ملک حسن اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

"خودی کی انتہا کے بعد بے خودی شروع ہو جاتی ہے۔اس طرح یہ بھی ان کے فلسفہ خودی کا ایک حصہ ہے۔اسرارِ خودی کے بعد انھوں نے ایک نظم رموزِ بے خودی لکھی جس میں بتایا ہے کہ خودی کو بلند کر کے انسان بے انتہا قوت کا مالک بن جاتا ہے تو اسے یہ قوت اپنی ات کے تحفظ کے لیے اور انسانیت کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں استعمال کرنی چاہیے بلکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔" ۹

فرد و ملت کا احترام و نظام ایک دورے کے ساتھ وابستہ ہے۔فرد کا جماعت میں کم ہونا خودی کو سوخت کرنا نہیں بلکہ قطرے کا قلزم بننا ہے۔زندگی کی اقدار کا سرمایہ ملت ہی کے گنجینے میں ہوتا ہے۔نوع انسان جو کچھ قرون میں بہ دوران ارتقا پیدا کرتی رہی ہے ماضی اور مستقبل اس کی ذات میں ہم آغوش ہیں۔افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں لیکن جماعت باقی رہتی ہے۔فرد کے اندر ترقی کی خواہش بھی جذبہ ملی سے پیدا ہوتی ہے اور خیر و شر کا معیار بھی حیات ملی کی پیداوار ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ تو نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو نہیں پہچانا۔اس لیے وہم و گمان میں مبتلا ہو گیا اور اسے باہم متضاد سمجھنے لگا۔فرد کی ذات کے اندر ایک جوہر نور ہے۔اس نفس واحدہ میں دوئی نہیں۔لیکن مظاہر حیات میں یہ وحدت من و تو کا امتیاز پیدا کر لیتی ہے۔اس کی فطرت آزاد خود اپنی تکمیل کے لیے آئین کی زنجیریں بناتی ہے۔بے خودی کی تعریف میں ملک حسن اختر تحریر کرتے ہیں:

"اقبال نے نفی،وجود کی بجائے اثباتِ وجود کا نظریہ پیش کیا۔انھوں نے صوفیا کے نظریات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا اور پھر اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا جو قرآنی مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔سب سے پہلے خودی کا مطلب بدل دیا اور اس سے وجود مراد لینے کی بجائے روح مراد لی۔انھوں نے صوفیا کا یہ نظریہ قبول کر لیا کہ خودی خدا کا ہی جز ہے اور اسی سے علیحدہ ہو کر ایک مستقل وجود اس نے حاصل کر لیا ہے۔اس خیال کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔چنانچہ اقبال نے صوفیا کی یہ تشبیہ بھی اپنالی کہ خدا سمندر ہے اور انسان ایک قطرہ جو سمندر سے الگ ہو گیا ہے۔مگر یہ قطرہ اب قطرہ نہیں رہا بلکہ گوہر بن گیا ہے۔یہ گوہر بغیر سمندر کے وجود میں نہیں آسکتا۔" ۱۰

انفرادی حالت میں خودی بالکل خود مختار، مطلق العنان اور سراپا غرور ہوتی ہے لیکن جماعت میں شامل ہو کر یہ تمام اخلاق رذیلہ بدل جاتے ہیں اور ان کے بجائے باہمی لطف و محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔اس لیے علامہ اقبال نے فلسفہ بے خودی کی بنیاد رکھ کر اسے یورپ کی جمہوریت اشتراکیت،فسطائیت اور قومی اشتراکیت جیسے فلسفوں سے بالکل علیحدہ کر دیا اور فرد کا روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود و قوم و نسل، رنگ و نسب یا وطن کی رائج اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار و خیالات سے اس کی حد بندی ہوتی ہے۔فرد بطور ایک معاشرے کے رکن کے تصادم، تعاون، عدم تعاون، مطابقت اور عدم مطابقت کے اصولوں کے ذریعے اپنے آپ کو بھرپور طریقے سے ظاہر کر سکتا ہے۔اثبات ذات کرنے والے افراد ہی کے ذریعے ملت وجود میں آتی ہے اور تکمیل پاتی ہے۔اس طرح اقبال فرد کی آزادی پر پابندی لگا کر اسے ایک اہم آہنگ معاشرے کا رکن بنانے کے لیے اس کی مادر پدر آزادی ختم کر دیتے ہیں۔ملک حسن اختر "اطرافِ اقبال" میں اقبال کے تصورِ عشق پر اپنی گفتگو کا آغاز ان اشعار سے کرتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دم جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفیؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق عربی زبان کا لفظ ہے۔ محبت کا بلند تر درجہ عشق کہلاتا ہے اور یہی محبت کسی درجے پر جا کر جنون کہلاتی ہے۔ ملک حسن اختر عشق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''عشق کا مطلب ہے کسی چیز کا حد سے زیادہ شوق ہونا۔ عشق میں حد سے بڑھے ہوئے ہونے کا مطلب موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض صوفیوں نے خدا سے بندے کا عشق ناجائز قرار دیا ہے۔ البتہ بندے سے خدا کا عشق روا رکھا ہے۔ مگر کچھ صوفیا ایسے بھی ہیں جو بندے سے خدا کا عشق بھی جائز نہیں سمجھتے لیکن خدا اور بندے کے درمیان محبت کو روا سمجھا گیا ہے۔'' ۱۱

عشق کا محرک مجازی یا حقیقی ہو سکتا ہے۔ یہ عشق ناممکن کو ممکن بنا ڈالتا ہے۔ عشق کے مدارج مختلف ہیں۔ کوئی مجازی میں ہی گھر کر رہ جاتا ہے تو کوئی عشق مجازی سے حقیقی تک رسائی حاصل کر کے حقیقی اعزاز و شرف حاصل کرتا ہے۔ صوفی شعرا جو ''ہمہ اوست'' کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی وجود اور حقیقت صرف ذات، باری تعالیٰ کا ہے۔ کائنات فریب محض ہے اور عقل جو علم کائنات کے حصول کا ذریعہ ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ عشق ہی وہ ذریعہ ہے جس سے حقیقی وجود یعنی ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ تصوف میں یہ نظریہ عشق دراصل فلسفہ اشراق سے آیا ہے جس کے نزدیک یہ نظام عالم 'مہر و قہر'' کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ نظام عشق ہی کی بدولت تکمیل پاتا ہے۔

اشراقی فلسفیوں کا یہی عشق ہے جس کو ہمارے صوفیوں نے وحدت الوجود کی شکل میں لیا ہے اور وہ تصوف کی راہ سے صوفیانہ شاعری میں آیا اور اس عشق کے ذریعہ سے صوفیانہ نظریات قائم ہوئے۔ صوفیوں کے نزدیک عشق وہ ہے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں عشق مطلق کہتے ہیں یا عشق حقیقی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ عشق حقیقی دراصل مجرد محبوب اور اس کے محبوب کی لگن کا نام ہے جسے دیکھا نہیں اور اس کے لیے صوفی تمام عمر آرزو کرتے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ وہ اس محبوب تک پہنچنے کے لیے، اس عشق میں کامرانی کے لیے ایک ظاہری ریاضت کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ اس ظاہری ریاضت کا نام عشق مجازی ہے۔

اقبال نے اس فطری جذبہ عشق کا تصور ایک اور زاویے سے دلایا ہے۔ صوفی کہتا ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کے لیے خودی کو مٹانا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک عشق کے کمال کی علامت یہ ہے کہ مادی وجود کو خود کو مٹانے دیا جائے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت ضروری قرار پائی ہے نہ کہ اس کا مٹا دینا۔ اقبال نے بارہا کہا ہے کہ خودی عشق سے استوار ہوتی ہے۔ اور یہ عشق نہ تو صوفیانہ عشق ہے جو خود کو بالکل فنا کر کے کمال حاصل کرتا ہے اور نہ وہ مجازی عشق ہے جو معمولی آرزوؤں کے لیے تڑپتا ہے بلکہ اقبال کے نزدیک عشق کا تصور بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس کے لیے اقبال نے کئی تعبیریں اور تفسیریں کی ہیں۔

عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
[[

''عشق خودی کی تکمیل کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے کیونکہ عشق کی بدولت عمل کی بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں عاشق لاغر اور کمزور نہیں نظر آتا بلکہ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے اور کائنات کی تسخیر کے منصوبے بناتا ہے۔'' ۱۲

اقبال کا عشق ہمہ جہت ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات اور خدا سے محبت عشق کی اعلیٰ صورت ہے۔ عشق انسانی حیات کے ارتقا میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ عشق اپنے مقاصد سے جنون کی حد تک لگاؤ کو کہتے ہیں۔ عشق ہی درد ہوتا ہے اور عشق ہی دوا بھی۔ عشق ہی راستہ، عشق ہی منزل۔ اقبال عشق کی کیفیات و تاثرات میں وہیں جا پہنچتے ہیں

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

جہاں ان کے مرشد حضرت رومی پہنچے تھے۔اگرچہ وہ جوش و مستی جو روانی کے یہاں ملتی ہے۔اقبالؒ کے ہاں نہیں ملتی۔لیکن کم از کم فکر سخن میں وہ رومیؒ سے ہر گز پیچھے نہیں رہے۔اقبال کے نزدیک عشق اور خودی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔عشق کا خاصا یہ ہے کہ کسی کو پالینے، مسخّر کرنے کی صلاحیت اور آرزو رکھتا ہے اور خودی کا خاصا بھی یہی ہے کہ وہ غیر خودی کو مسخّر کرنے یا پالینے کی اندرونی صلاحیت رکھتی ہے۔عشق کا یقین اٹل اور محکم ہوتا ہے اور خودی بھی یقین محکم کے پہیوں پر چلتی ہے۔عشق کا وصف ہے کہ وہ پریشانیوں کے اندر رنگا رنگیوں کے اندر اور بے نظمی کے اندر ترتیب حیات کرتا ہے۔اور ساری پریشانیوں اور سرکشیوں کے باوجود تنظیم حیات کا کام کرتی ہے۔عشق کی خاصیت ہے کہ پالینے کے باوجود، اطمینان حاصل کر لینے کے باوجود ایک نئی آرزو پیدا کرتا ہے۔ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے ہاں عشق بے موت نہیں مارتا ہے بلکہ لافانی بنادیتا ہے۔اس لیے وہ عشق کے لوازمات سے بھی محبت کرتے ہیں اور ان کو تکالیف و مصائب کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔آرزو عشق کی بنیاد ہے۔یہ ایسی چنگاری ہے جو شعلہ بن کر عشق کہلاتی ہے۔اس لیے اس کا چراغ دل میں روشن رہنا چاہیے۔''۱۳

ملک حسن اختر مختلف شعراء کے ہاں عشق کا موازنہ اقبال کے فلسفۂ عشق سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرؔ کے ہاں عشق اسے بے موت مار دیتا ہے اور بالآخر عشق کے مصائب سے تنگ آکر عاشق پکار اٹھتا ہے:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

[

اور غالبؔ کے ہاں یہ دماغ کا خلل قرار پاتا ہے جبکہ دردؔ کہتے ہیں کہ خودی کو مٹا کر ہی انسان خدا سے مل سکتا ہے۔اقبال کے ہاں زندگی کی پائندگی کے لیے آرزو آبِ حیات ہے جبکہ آرزو کی موت سے مسرت پیدا ہوتی ہے اور اقبال کے ہاں حسرت کا کوئی کام نہیں ہے۔عشق کی آماجگاہ چونکہ دل ہے۔اس لیے اقبال کے نزدیک یہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔وہ اس دل کی تعریف کرتے ہیں جو عشق کا حامل ہو اور سوز و تپش سے اس نے زندگی حاصل کی ہو۔اور یہ عشق اپنے مقصد کے حصول کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگاتا ہے۔

اقبال عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں۔اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے یعنی بجائے خود تخلیق کی ذمہ داری سے عہد برا نہیں ہو سکتی۔جب تک عشق وجدان اس کی پشت پناہی پر موجود نہ ہوں وہ خود آگے قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچاتی ہے جبکہ عشق زندگی کے قافلے کی رہبری کرتا ہے۔سو اقبال عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں جسے ملک حسن اختر نے انتہائی مدلل انداز میں ثابت کیا ہے۔

مرد مومن کا نظریہ اقبال کے نظریہ خودی کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔کلام اقبال ہمیں جابجا ''مردِ مومن'' کا ذکر ملتا ہے اور کہیں اس کی بجائے اقبال کے انسانِ کامل، مردِ حق، مردِ قلندر، بندۂ آفاقی، بندۂ مومن اور مردِ خدا کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔یہ تمام اصطلاحات اقبال نے اپنے تصور معاشرہ میں فرد کے سلسلے میں استعمال کی ہیں۔یہ تمام اصطلاحات اقبال نے اپنے تصور معاشرہ میں فرد کے سلسلے میں استعمال کی ہیں۔اقبال کے نزدیک فرد کا نصب العین ''مردِ مومن'' اور جماعت کا نصب العین '''ملتِ اسلامیہ'' ہے۔اقبال نے ''مردِ مومن'' کا جو تصور پیش کیا ہے وہ نطشے کے سپر مین یا انسانِ کامل سے مختلف ہے۔ان کے مردِ مومن پر نطشے سے زیادہ الجیلی کے ''انسانِ کامل'' کا اثر ہے۔جب کوئی شخص خودی کے تیسرے مرحلے یعنی نیابت الٰہی کو پالیتا ہے تو وہ مردِ مومن کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔اقبال مردِ مومن کے ایمان و یقین کی قوت سے دنیا مسخر کرنے کا درس دیتے ہیں۔مردِ مومن کی ایمان کی یہ قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان انسانوں سے جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اسے ممتاز کرتی

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

ہے۔وہ بزدلی کے مقابلے میں اپنی شجاعت و مردانگی کی وجہ سے تمام انسانوں سے مختلف ہیں۔انسانِ کامل کا توحید پر ایمان اسے مال وزر کے غلاموں سے الگ ایک بلند مقام عطا فرماتا ہے۔ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

"نیابتِ الٰہی کے اس مرتبہ پر پہنچنے کے لیے اسے اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے دراصل اقبال کا مردِ مومن خلافت الٰہیہ کے تصور پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنی رہنمائی کے لیے ہمیشہ قرآن کی طرف دیکھتا ہے۔اس کے علاوہ اقبال نے اس کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے اسلامی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔" ۱۴

اقبال کا مردِ مومن، آفاقیت، انسان دوستی اور وطن پرستی کا درس دیتا ہے اور تعصبانہ سوچ کی نفی کرتا ہے۔اس کی زندگی کی اقدار کا سرچشمہ دینِ اسلام ہے۔انسان کے متعلق اقبال کا تصور اصولی طور سے قرآنی ہے۔انھوں نے یہ تصور خودی کے نظریے سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔اس میں صاحبِ ایمان انسان کو "نائب حق" اور "مردِ مومن" سے مخاطب کیا گیا ہے اور قرآنی الفاظ میں "عبد" کہا گیا ہے۔لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال کے نزدیک عبد اور عبدہ سے حضور سرور کائنات کی ذاتِ مبارک مراد ہے۔اقبال کے ہاں انسان خدا کا مطلوب ہے۔کائنات کی تمام چیزیں اپنی تقدیر کی پابند ہیں جبکہ مومن تقدیر کا نہیں صرف احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
[[

مردِ مومن اللہ کی ذات پر کامل ایمان کی بدولت، عزم و استقلال اور ناقابل شکست جرأت و ہمت کا حامل ہوتا ہے اور راہِ حق میں بڑی سے بڑی طاقت کے بالمقابل عزم و ہمت کی ایک چٹان بن جاتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
[

مردِ مومن کے اخلاق و کردار قرآنی ہوتے ہیں اس کے کردار میں جلالی و جمالی دونوں صفات موجود ہوتی ہیں وہ گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار و میں کردار میں اللہ کی برہان
[

اقبال نے جس مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے وہ نائب خدا اور خلیفۃ اللہ ہے۔وہ ہی تخلیق کائنات کا مقصود ہے۔حقیقی اور "انسان کامل" ہے۔وہ ان تمام اوصاف و کمالات سے متصف ہے جو مشیت الٰہی میں اسی کے لیے امانت رکھے گئے اور جس کی بدولت اسے "احسن التقویم" کے معزز لقب سے نوازا گیا۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

ملک حسن اختر کے مطابق اقبال کے خیالات نطشے سے مستعار ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر براؤن کا خیال ہے اس سے اختلاف کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اقبال کا ''مردِ مومن'' نطشے کے ''سپر مین'' سے بالکل مختلف ہے۔

> ''لیکن پروفیسر براؤن کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے کیونکہ اقبال کے مردِ مومن اور نطشے کے فوق البشر میں وہی فرق ہے جو ہٹلر اور فاروق اعظمؓ میں ہے۔ نطشے اندھی قوت کا پجاری ہے۔ وہ اپنے فوق البشر پر سے دوسرے لوگوں کو قربان کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل مقصد فوق البشر کی پیدائش ہے۔ باقی لوگ تو اس کے غلام اور اس کی خواہشات کے پابند ہیں۔ نطشے کا فوق البشر بے انتہا قوت کا مالک ہے اور اقبال کا مردِ مومن بھی بے حد قوت رکھتا ہے۔ اسی لیے بظاہر دونوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔ ورنہ دونوں میں اختلافات کے بے شمار پہلو بھی ہیں۔ نطشے کی اقبال نے تعریف بھی کی ہے اور اس کے قلب کو مومن مگر دماغ کو کافر قرار دیا ہے۔''۱۵

نطشے ایک ارتقائی مفکر ہے مگر دوسرے ارتقائی مفکروں سے اس کا نقطہ نظر کسی قدر الگ ہے۔ ڈارون اور اینسر اور ان کے پیرووں نے تنازع البقا کو انواع کی پکار قرار دیا اور اگر اس کش مکش میں کوئی مقصد ہو تو وہ مقصد یہ ہے کہ ایک نوعت بقائے حیات کے لیے دوسروں سے زیادہ قوی اور صالح ہو جائے۔ نطشے جب فوق البشر کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مطمع نظر نوع نہیں بلکہ فرد ہے۔ تاریخ اور فطرت کا یہ میلان ہے یا ہونا چاہیے کہ اس میں اعلیٰ درجے کے افراد پیدا ہوں جو آئین مساوات کے زیر اثر نہ ہوں۔ حقیقت میں آزاد ہوں، مقلد نہ ہوں۔ صداقت کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مقدم سمجھیں، سود و زیاں اور بیم و رجا سے پیدا شدہ امتیاز خیر و شر سے ماورا ہوں جن کا قانون خود اپنے اندر ہو، جن کو ہر حیات بخش چیز صحیح اور ہر حیات کش طریقہ ناقابلِ قبول معلوم ہو۔ زندگی کا مدار اگر محض عوام کی رائے پر ہوتا جہاں برائے نام جمہوریت کا نظام پایا جاتا ہے وہاں بھی حقیقی فیصلے چند قوی افراد ہی کرتے ہیں۔ جبکہ اقبال کے ''انسانِ کامل'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجاز عمل سے تجدید حیات کرتا ہے۔ اس کی فکر زندگی کے خواب پریشاں کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہ پیش کرتا ہے۔

فطرت کے تقاضوں پر نہ کر راہ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا

مردِ مومن جرأت مند، حق گو اور بے باک ہوتا ہے۔ اسے مال و دولت اور جاہ و حشم کی کشش اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ کیونکہ مومن کے دل میں ''فقر و غیور'' کی دولت ہوتی ہے۔ اقبال مردِ مومن کی صفات اور اس کے انفرادی ارتقاء کی منازل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ وہ اس معاشرے کی بھی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔ اقبال کی حساس طبیعت کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں لیکن وہ امید کا پیامبر انھیں مایوس نہیں کرتا اور وہ پیامبر ''مردِ مومن'' ہے کیوں کہ ایک جہانِ نو'' پیدا ہو رہا ہے جس کی امامت کا اہل صرف ''مردِ مومن'' ہے۔

ملک حسن اختر اقبال کے تصور فن پر اور ان کے تنقیدی نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال چونکہ ایک فلسفی ہیں اس لیے وہ ایسے فنون کو پسند کرتے ہیں جو ایک بہتر معاشرے کی تشکیل میں مددگار ہوں۔ اقبال فن کو زندگی کا خادم خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی شخصیت کی قوت اور جوشِ عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے۔ یہی کیفیت فن کی جان ہے۔ اس میں جلالی اور جمالی دونوں عنصر ہونے چاہئیں۔ ''ضربِ کلیم'' میں اقبال نے ''ادبیات اور فنون لطیفہ'' کے تحت چالیس سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال فنون کو نفسِ انسانی کا ایک فطری تقاضا سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ انسان کی کلیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اسے فن یا ادراک فن حاصل نہ ہو، قدرت نے انسان کو حسن تراشنے کا ذوق عطا کیا ہے اور یہ نفس انسانی کا فطری خاصا ہے جو باہر سے

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

کوئی سوسائٹی انسان پر نافذ نہیں کرتی، بلکہ طبع داخلی کا ایک سلسلہ عمل ہے۔اس مقام پر گویا فن مشترک گوشے کا عمل ہے۔ فن کار الہامی کیفیت رکھتا ہے اور چونکہ وہ اس صفت سے زیادہ مزین ہیں اسی لیے اس الہامی بے ساختگی کے ساتھ ایسی چیزوں کی تشکیل کرتا ہے جنھیں آگے چل کر فن کہا جاتا ہے۔اقبال کے نزدیک فن ایک الہامی چیز ہے اور یہ کسی کو حاصل ہوتا ہے۔اس لیے الہامیت کے ساتھ مخصوص قسم کی اصلیت کا تصور وابستہ ہے۔

اقبال نے جب فن کو الہامی چیز قرار دیا تو اس کے ساتھ نقالی کی شدید مخالفت کی اور نقالی کی مخالفت اس طرح کی کہ فن کے بڑے بڑے مسالک سے اختلاف کیا۔اقبال چونکہ نقالی کے نظریے کے مخالف ہیں اس لیے انھوں نے زیادہ مخالفت فطرت نگاروں کی ہی کی ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ فطرت کی چیزوں کی نقالی کر لینے سے کمال کہاں سے پیدا ہو۔اصل کمال یہ ہے کہ جو فطرت نہ کر سکی انسان وہ کرے۔اس کی تکمیل کرے، کیوں کہ انسان نیچر سے بلند تر اونچی اور باشعور مخلوق ہے۔

اقبال افراد میں خودی کا جذبہ پیدا کر کے ان کو مردِ مومن کے بلند مقام پر لے جانا چاہتے ہیں۔چنانچہ ان کے نزدیک وہی فن سب سے بہتر ہے جو خودی کو بیدار کرے اور اس کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو جو جذبات کی اصلاح کر کے انسان کو پاکباز اور پاک نگاہ بنائے۔

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ

اقبال کے نزدیک وہ فن ناپختہ اور ناقص ہے جس سے علم و شعور کے معانی و معارف وابستہ نہ ہوں۔جس میں حقائق عالیہ نہ ہوں، مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال کے دل میں اس عمارت سے وابستہ سارے حقائق اتر آئے۔مثلاً خدا کی عظمت، انسان کا شرف، اس کی قوت تسخیر کی وسعتیں وغیرہ۔غرض فن کو خط آفرین ہی نہیں، بلکہ شعور بخش اور علم بخش بھی ہونا چاہیے۔اور پھر فن بانگ سرافیل بھی ہے۔اسرافیلؑ جب پھونکیں گے، میدان محشر بپا ہو گا۔فن بھی وہ چیز ہے جس کا ایک لازمہ یہ ہے کہ وہ دل پر سلاد دینے والی کیفیت طاری کرے، بلکہ ارفعیت کی طرف اٹھانے والا، ہو تسخیر پر مائل کرنے والا ہو، ہنگامہ پیدا کرنے والا ہو۔اقبال کے نزدیک فن مسرت کے علاوہ عمل پر اکسانے والا بھی ہے۔اقبال دیگر فلسفیوں کی طرح زندگی کے بے کار عملوں کو ناپسند کرتے ہیں۔اس لیے نقادوں کے ساتھ نفع آور عنصر شامل کیا ہے۔لیکن اقبال اپنے نظریات یہیں تک محدود نہیں کرتے، وہ اس سے آگے بڑھتے ہیں اور فن کو برانگیختہ کرنے والی چیز قرار دیتے ہیں۔

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

اقبال کا موازنہ جب ملک حسن اختر دوسرے نقادوں سے کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ فن افلاطون سے مشابہ تو ہے لیکن مختلف ہے۔کیوں کہ افلاطون اور اقبال کے شر کے متعلق نظریات میں نمایاں فرق ہے۔افلاطون کے نزدیک ''شاعری اور فلسفہ میں ازلی بیر ہے'' مگر اقبال شاعری اور فلسفے کی دشمنی اور بعد کے قائل نہیں۔وہ تو دونوں میں گہرا اشتراک محسوس کرتے ہیں۔ان کے ہاں فلسفہ اور شعر کی حقیقت ایک ہی ہے۔ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

''جستجو اور آرزو عمل کو پیدا کرتی ہیں۔جو محنت اور کوشش کا طالب ہوتا ہے۔چنانچہ اقبال کے نزدیک کوشش اور محنت پیہم ہی سے ہنر اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے۔یہ درست ہے کہ شاعری اور فن کا مادہ فطرت کی طرف سے انسان میں ودیعت ہوتا

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

ہے۔شاعرانہ صلاحیت خداداچیز ہے مگر اس کو کوشش اور محنت سے چمکایا جاسکتا ہے۔اور مسلسل محنت نہ کی جائے تو پھر اس مخفی صلاحیت کو اجاگر کر کے اس سے پورا کام نہیں لیا جاسکتا۔" ۱۶

اقبال کی خودی کے مضمرات فن کے بہترین امکانات کو روبہ عمل لاتے ہیں۔خودی کا مقصود عرفان حق ہے اور معرفت نفس اسی کی تمہید اور وسیلہ ہے، یہ عرفان حق ہی عشق کا وہ تصور پیدا کرتا ہے جس کے بغیر فن کا کوئی عظیم نمونہ بروئے تخلیق نہیں آسکتا۔یہ عشق ہی ہے جو فن کار کے اندر ایک سوز و گداز پیدا کرتا ہے اور اسے تاب سخن عطا کرتا ہے۔ذوق و شوق سے سرشار کرتا ہے اور بہتر سے بہتر حسن کاری پر آمادہ کرتا ہے۔تخلیق جمال کی اس قوت محرکہ کے لیے اقبال نے متعدد فکر انگیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔عبدالمغنی کے بقول:

"اقبال نے تخیل و تفکر، لفظ و معنی اور آمد و آورد کے باہمی تعلق تناسب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے خیال میں "لطیف گویائی"، فکر کی پرواز (بمعنی تخیل) میں "حقیقت" (بمعنی تفکر حقائق) سے غفلت نہ ہونی چاہیے۔" ۱۷

یہ فکرِ کامل ہی ہے جو شاعر کو "کھری بات" کہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور فن کار کے اندر وہ "جرأت اندیشہ" پیدا کرتی ہے جسے اقبال، شان خلیل سے تعبیر کرتے ہیں۔فن کے نقطہ نظر سے اصل اعتبار اس بیان کا ہے کہ "رمز و ایما" اس زمانے کے لیے موزوں نہیں بلاشبہ یہ ایک تنقیدی بیان ہے اور اس میں ایک زبردست عصری آگہی موجود ہے۔

اقبال کا تصورِ تعلیم بھی ان کے فلسفہ خودی سے ہم آہنگ ہے۔وہ طلبا کو کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب بنانا چاہتے ہیں اور روح میں ایک اضطراب پیدا کرنا چاہتے ہیں جو انسان کو بدل کر رکھ دے اور اسے مردِ مومن بنادے۔اقبال کے فلسفہ تمدن میں ایک بڑا موضوع تعلیم ہے۔تعلیم کسی کو علم سکھانے کا نام ہے۔بظاہر تعلیم کا بڑا مسئلہ علم سے تعلق رکھتا ہے۔یعنی کون سا علم سامنے رکھنا چاہیے اور کسے مقاصد تعلیم کے اعتبار سے ترجیح دینی چاہیے۔اس طرح مسئلہ علم نظریۂ تعلیم کے تابع ہو جاتا ہے۔تمام بحثوں کو یکجا کیا جائے تو نظریہ علم کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک نظریہ علم وہ ہے جو کہتا ہے کہ علم اُسی خلاصہ افکار یا نتائج کا نام ہے جس کا سرچشمہ تعلیم یا علم عقل ہے۔دوسرا نظریہ وہ ہے جو ہمیشہ رہا ہے کہ علم صرف اس چیز کا نام نہیں جو حواس اور عقل کے ذریعے حاصل ہوتی ہے بلکہ اس کے حصول کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جسے ایمان و وجدان کہتے ہیں۔ایمان و وجدان کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عقلی سے زیادہ یقینی اور کامل ہوتا ہے۔یہ نظریے انسانی تاریخ میں بار بار ایک دوسرے کے سامنے آتے رہتے ہیں۔اقبال کے نزدیک علم کے دونوں نظریے صحیح اور جائز ہیں۔وہ علم جو باطنی قوت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔دونوں کو باہم ملانا اور ان کے درمیان ربط قائم کرنا علم کے مفکر کے لیے بڑا ضروری ہے۔ورنہ اس سے وہ ادھوراپن پیدا ہو گا جو حقیقت آشنائی کے مقصد کے خلاف ہو گا۔اس نظریہ علم کی روشنی میں تعلیم کے بارے میں اقبال کے خیالات واضح ہو جاتے ہیں۔اقبال کے نزدیک مکمل تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس میں علم کی دونوں صورتوں کو رکھا گیا ہو۔کسی نظام تعلیم میں عقلی علم یا مخصوص روحانی علم پر بنیاد ہونا اس کے ناقص ہونے کو ظاہر کرتی ہے گویا پہلا بڑا رکن یا اصول ارتباط علم عقلی و علم وجدانی ہے۔

اقبال خود فرماتے ہیں کہ علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے "جاوید نامہ" میں کہا ہے:

علم حق اول، حواس آخر حضور
آخر او می نہ گنجد در شعور

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

وہ علم جو شعور میں سانہیں سکتا اور جو علم کی آخری منزل ہے، اس کا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامے میں کئی اشعار درج ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں
[[

اور اخلاق و معاشرت سے پہچانی جاتی ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے تعلیمی فلسفے کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہے جو تن سے لے کر من کی دنیا تک محیط ہے۔ اس لحاظ سے کسی عمدہ تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ وہ متعلم کو زندگی کی پوری وسعتوں سے آگاہ کر سکے تاکہ وہ ان سے بہرہ مند ہو کر ارتقائے حیات کا فریضہ انجام دے۔ اقبال ارتقائے حیات کے لیے تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ تاکہ متعلم اپنی تمام صلاحیتوں کو کام میں لا کر کائنات کی لامحدود وسعتوں کو اپنی رفعت خیال سے مسخر کرے۔ اقبال کا فلسفہ خودی ان کے کلام میں ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ ان کا فلسفہ تعلیم بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا نظام ایسا ہونا چاہیے جو خودی کی تربیت کرے نا کہ وہ بیکار نظام تعلیم جو فرد کی خودی کو ختم کر دے۔ اسی لیے ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ''......اقوامِ مغرب کا دیا ہوا تصورِ تعلیم مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ پھر انگریز تو یہاں آقا بن کر آئے تھے۔ وہ ہمیں شاہینی کا سبق کیسے سکھاتے مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ جس طرح ہم نے انگریز کے دیے ہوئے نظامِ حکومت کو قبول کیا۔ اسی طرح اس کے عطا کردہ فلسفہ تعلیم پر بھی عمل پیرا رہے۔ ہم نے اس سبق کو بھلا دیا جو قائداعظم نے دیا تھا اور اس علاج سے منہ موڑ لیا جو حکیم الامت نے تجویز کیا تھا۔ ہمارے دل کی ناکامی اسی طرح قائم رہی اور آبِ نشاط انگیز ہمیں نہ مل سکا۔ کوتاہی ہماری ہو یا ساقی کی مگر سزا ہمیں مل رہی ہے۔ ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں ہیں۔ کمیشن بیٹھتے ہیں اور اُٹھ جاتے ہیں نہ معلوم ہمارے سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ غلاموں کا نظامِ تعلیم آزاد بندوں کے لیے موزوں ہو ہی نہیں سکتا۔''۱۸

اقبال کے دور میں دینی مدارس کے علاوہ انگریزی مدارس تھے جن میں جدید طریقہ ہائے تعلیم رائج تھا جس کا مشاہدہ اقبال اپنے قیام یورپ کے دوران بھی کر چکے تھے۔ یہ طریقہ سراسر مادیت کا علمبردار تھا۔ اس میں دین و مذہب ثانوی چیزیں تھیں۔ تعلیم کا اصل مقصد حصول معاش تھا۔ یہ طریقہ نوجوانوں کو بلند پایہ اسلامی اقدار سے محروم کرنے کے لیے رائج کیا گیا تھا۔ جدید مغربی تعلیم نے مسلمانوں کو تن آسانی، لاپرواہی، تعین و آرام اور فیشن پرستی میں مبتلا کر کے ان کے عقائد کو متزلزل کر دیا۔ اقبال اس مغربی نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور انداز تعلیم کو اسلامی اقدار حیات اور روایات ملی کے منافی قرار دیتے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
[[

اقبال نے اپنے کلام میں جابجا تعلیم جدید کی مخالفت کی ہے۔ اور یہ مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ جوانوں میں توحید کی بجائے الحاد پھیلاتی ہے۔ اس لیے اقبال تعلیم کو مذہب سے بیگانہ نہیں کرتے وہ تعلیم سے جو الحاد پھیل رہا ہے اس سے سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

[[[

اسی طرح اقبال کا بنیادی فلسفہ خودی ہے جبکہ انگریزی نظام تعلیم مسلمانوں کی ملی روایات کے سراسر خلاف ہے۔ان کی رائے ہے کہ جدید تعلیم نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت پر توجہ کی۔ قلب و روح کی تطہیر اور نشو و نما، اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی اور پختگی کی طرف توجہ نہ دی۔نہ ہی افراد کی خودی کی تربیت میں کوئی کردار ادا کیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم اور عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے اور اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

اس تعلیم سے جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے اس میں صرف یہی نقص نہیں کہ وہ ملت اسلامیہ کے دینی اور روحانی اصول پر قائم نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں یورپین قوموں کی خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

[

ملک حسن اختر اقبال کا تصورِ تعلیم واضح کرتے ہوئے مزید رقم طراز ہیں:

"اقبال نے بھی مسلمانوں کو زندگی گزارنے کا نظام دیا ہے۔ان کا یہ نظام قرآن کے زریں اصولوں سے تیار ہوا ہے اور اس کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ان کا فلسفہ تعلیم بھی ان کے فلسفہ خودی کا ہی ایک حصہ ہے۔ان کے نزدیک بہترین نظام تعلیم وہی ہے جو خودی کی تکمیل کرے، عشق کی قوتوں کو سرگرم کار کرے۔ عملِ پیہم کا درس دے، تخلیقِ مقاصد کا اہل بنائے اور شعاعِ آرزو کو تابندہ رکھے۔"19

علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ خودی کی نشو و نما کرے۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار نسل کو صرف فکر معاش ہوتی ہے اور اسی فکر نے تمام اقوام کو غلام بنا رکھا ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ تعلیم جس پر مذہب،اخلاق اور عشق و عمل سب کو قربان کیا جارہا ہے۔معاش کا بھی کافی انتظام نہیں کرتی۔

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

[

اسی طرح اقبال کے نزدیک خواتین کے لیے بھی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے مگر یہ تعلیم ایسی نہیں ہونی چاہیے جو عورت کو اس کے فطری فرائض سے غافل کر دے۔اقبال نے اپنے قیام یورپ کے دوران دیکھا کہ سائنس کی بے تحاشا ترقی کی بدولت اور مغربی تعلیم کی وجہ سے عورت اپنے مادرانہ فرائض سے روگردانی کرنے لگی ہے۔در حقیقت نئ نسل کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کے اتنے بڑے فریضے سے روگردانی قومی خودکشی کے مترادف ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

اقبال کے نزدیک عورت کا کمال یہ نہیں کہ وہ علم وفضل میں ارسطو اور افلاطون بن جائے بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون پیدا کرے۔اقبال اس مادر پدر آزادی کے سخت مخالف ہیں جس میں دین،مذہب،اخلاق،سماجی قیود،انسانیت سب کو مشکوک نظروں سے دیکھا گیا ہے۔عملی اور فکری بے راہ روی کی یہ صورت حال یورپ کے خاص روحانی بحرانات سے مخصوص ہے۔مگر ایشیا نے اب جو ذہنیت مستعار لے رکھی ہے اس کی وجہ سے یہاں بھی جھوٹ موٹ کے بحران روز پیدا ہوتے ہیں جن سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اور ہماری تعلیم محض غلامانہ انداز میں متاثر ہو رہی ہے۔اقبال تعلیم میں ایسی آزادی کے مخالف ہیں۔

مغربی درسگاہیں افراد پر سختی کے سخت مخالف ہیں وہ تعلیم اس قدر نرمی سے دیتے ہیں کہ ان کی تربیت یافتہ افراد سخت کوشی کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔جبکہ اقبال کے نزدیک تعلیم میں سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔اسی بات کو ملک حسن اختر یوں تحریر کرتے ہیں:

> ”علامہ اقبال تعلیم کو لازمی اور جبری کرنے کے قائل تھے۔انھوں نے گوکھلے کے لازمی تعلیم کے مسودہ قانون کے متعلق تقریر کرتے ہوئے اسکی حمایت کی تھی۔جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔اسی طرح جبریہ تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔“ ۲۰

اقبال مغرب کے بعض تعلیمی فلسفوں اور تجربوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور تعلیم میں سختی یا نرمی کا مسئلہ چونکہ اقبال کی نظر میں تعلیم میں منتخب افراد کی تربیت ہی ہر شے پر مقدم ہے۔اس لیے ان کے تصور تعلیم میں سخت نگرانی اور درشت انداز تربیت خاص طور پر ضروری ہے۔کیونکہ سخت کوشی و جانکاہی اقبال کے تصور خودی میں مرکوز ہے۔حرب و ضرب،رزم و پیکار اور جدوجہد کو انھوں نے عام زندگی میں جو اہمیت دی ہے اس کا اطلاق ان کے تصور تعلیم و تربیت پر بھی ہوتا ہے۔

اقبال کی نظر میں سب سے زیادہ اہم علم دین ہے اور یہ علم خدا،کائنات اور انسان کے مجموعی تشخص پر محیط ہے جس کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔علم دین میں خداشناسی کے سب ذرائع یعنی مذاہب، تفکر و تعقل، فلسفہ و حکمت اور سائنسی علوم سب شامل ہیں۔اس کے بعد تاریخ، پھر شاعری اور اس کے بعد دوسرے فنونِ لطیفہ آتے ہیں۔اقبال کے

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

نزدیک دین، عقل، تجربے کو متحد کرنے ہی سے انسان صحیح حقیقتوں کاادراک کر سکتا ہے سواقبال کے نزدیک تعلیم کی غایت نفس انسانی کو تسخیر کائنات کے لیے تیار کرنا ہےاوراس غرض کے لیےایسے افراد فائق پیدا کرنا ہے جو صالح سے صالح تر معاشرے کی تخلیق کر سکیں۔اس کے لیے تقویت خودی کی ضرورت بنیادی ہے۔ مگر یہ خودی وہ ہے جو انفرادیت کی یکسانیت سے لے کر ساری خدائی کی آفاقیت تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ مقامیت اور خصوصیت کو آفاقیت اور عمومیت سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

تصورِ تعلیم پر بحث سمیٹتے ہوئے ملک حسن اختر اقبال کے تصورِ ابلیس کو موضوع بناتے ہیں اور کلامِ اقبال میں ابلیس کا تصور اس قدر پختہ اور متحرک ہے کہ ہم اسے صرف شر کا نمائندہ کردار قرار نہیں دے سکتے۔قرآن مجید سے پہلے دنیا کے کسی ادب میں لفظ ابلیس نہیں ملتا۔ عربی، فارسی اور اردو میں لفظ شیطان کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ کبھی تواسے ایک شخص کے طور پر پیش کیا گیااور کبھی شعر کی علامت کے طور پر قرآن میں ہے کہ جب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت آدم کو سجدہ کریں تو ابلیس نے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے ملعون بنادیا اور وہ اولادِ آدم کو بہکانے کی کوشش میں لگ گیا۔ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ’’اقبال کا تصورِ ابلیس بھی ان کے فلسفہ زندگی سے ہم آہنگ ہے اور اسی روشنی میں انھوں نے اس کا مقام متعین کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے عام لوگوں کے خیالات کی پروا نہیں کی۔ عام لوگ ابلیس کا ناکارہ اور راندۂ درگاہ سمجھ کر اس کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔ان کو ابلیس کی ذات میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ان کے نزدیک وہ سرتا پا لعنت ہے مگر اقبال کو ابلیس کی ذات میں عظمت کے پہلو بھی نظر آتے ہیں اور ان کا شاعر دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔وہ اس کی زیرکی، قوت اور آزادی کو سراہتے ہیں۔اقبال نے قوت اور طاقت کو ہر جگہ پسند کیا ہے۔‘‘ ۲۱

اقبال وحدت الوجود کے قائل ہیں۔لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خیر کے ساتھ شر بھی خدا ہی کا پیدا کردہ ہے۔اور پھر مختلف انسانوں اور عناصر میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔اقبال کہتے ہیں کہ اس کائنات کی مختلف اشیا اور انسانوں کی خودی میں درجوں کا فرق ہے۔انسان کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کی خودی کم تر درجہ کی حامل ہیں۔یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ان کی خودی بھی مختلف درجوں پر ہیں۔کوئی اعلیٰ، کوئی ادنیٰ ہر جگہ فرق مراتب موجود ہے۔دنیا میں اسی طرح خیر اور شر موجود ہے۔ان کو ایک چیز قرار نہیں دیا جاسکتا۔اقبال کے نزدیک خیر کے ساتھ ساتھ شر کی بھی بڑی اہمیت ہے اور شر اس لیے ضروری ہے کہ وہ خیر کو آگے بڑھانے کا کام کرتا ہے۔اگر شر نہ ہو تو خیر کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع نہ ملے۔یہ سوال بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ خدا نے شر یا شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا؟اس کا جواب اقبال کچھ یوں دیتے ہیں کہ انسان جب اپنی ذات سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ شر سے ہی منفعت حاصل کی جاسکتی ہے۔دراصل شر ہی آدمی کی اصل شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔شر سے پیکار کر کے وہ اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔مشکلات نئی نئی ایجادات کا سبب بنتی ہیں۔سائنس کی ساری ترقی شر پر قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔

اقبالؒ نے ابلیس کے کردار کو اپنی نظم ’’ابلیس کی مجلس شوریٰ‘‘ میں انتہائی مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔اس نظم کے ذریعے ابلیس کے متعلق اقبال کی فکر کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔جس میں ابلیس خطاب کرتا ہے۔یہ خطاب ابلیس کی شخصیت اور کردار کا مؤثر اظہار ہے اور اپنے الفاظ کے رنگ وآہنگ سے وہ فطری طور پر کائنات کی ایک ایسی قوت کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جو عرصہ حیات میں اپنے عامل شر ہونے پر نازاں ہے اور اپنی تخریبی طاقت کے نشے میں چور ہے۔لیکن وہ خدائے کارساز کی برتری کو چیلنج نہیں کرتا بلکہ اپنے حریف آدم کی اولاد پر خدا ہی کے غضب کا اعلان کرتا ہے۔اس سلسلے میں جہاں اس کی دشمنی انسان کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے وہیں خدا کے ساتھ ایک قسم کی ہمدردی بھی ظاہر ہوتی ہے۔اندازِ گفتگو کی اس منطق سے خلافت آدم کے معاملے میں منصوبہ تخلیق پر ابلیس کے ازلی اعتراض کا اظہار ہوتا ہے۔اسی لیے ابلیس بہت خوش ہے کہ خدا اور ملائکہ نے دنیائے انسانیت سے جو توقعات، ابلیس کے خیال کے برخلاف قائم کی تھیں، وہ ختم ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم زاد کی نسبتی برباد ہونے والی ہے۔اس بربادی کو ابلیس اپنا کارنامہ تصور کرتا ہے۔اس لیے اپنے خیال میں تباہی کے اسباب اس کے ہی مہیا کیے ہوئے ہیں اور وہ عصر، حاضر میں خاطر خواہ نتائج پیدا کر رہے ہیں۔چنانچہ دورِ

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

جدید میں پھیلائے اپنے فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے ابلیس، ملوکیت، لادینی اور سرمایہ داری کو بنیادی اسبابِ تباہی کے طور پر پیش کرتا ہے کہ جس تمدن کے ہنگاموں میں ابلیس کا سوزِدروں ہو اس کی آتشِ سوزاں کو سرد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ یہ تمدن زمانہ حاضر کی ہواؤں میں بہت زیادہ برگ و بار لانے کے باوجود ایک "نخلِ کہن" ہے جسے شیطانی قوتوں نے صدیوں کی آبیاری سے شاداب کیا ہے۔

اقبال کے ہاں ابلیس کا تصور، ملٹن کے تصور سے مختلف ہے۔ اقبال کے ابلیس میں جہاں اس کی متکبرانہ شان و شوکت، طاقتوری اور رنگینی ہے وہیں اس کا قوتِ شر ہونا بھی واضح ہے اور اس قوت کا انسان کے مقابلے میں استعمال کیا جانا بھی معلوم ہے۔ جبکہ ملٹن کا ابلیس خدا کا حریف بننے کی کوشش کرتا ہے اور ملکوتی قوتوں کے مقابلے میں شہ زوری دکھاتا ہے چنانچہ ایک انتہائی کریہہ و مہیب شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اگر ابلیس کی ان دونوں تصویروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ آسانی سے واضح ہو گا کہ اقبال کی تصویر حقیقی، مستند اور متوازن ہے۔ جبکہ ملٹن کی تصویر فرضی، ناقابل اعتبار اور غیر معتدل ہے۔ اسی لیے ملٹن کے ابلیس میں ڈرامہ نگاری زیادہ اور شاعری کم ہے۔ لیکن اقبال کا ابلیس زیادہ شاعرانہ اور کم ڈرامائی ہے۔ اقبال نے ابلیس کے کردار میں اسلامی روایات کی حدود میں ایک موثر شاعرانہ شخصیت کی تعمیر کی۔ تمام مذاہب نے ابلیس کو خدا کا باغی قرار دیا۔ مگر ملٹن نے اسے خدا کا حریف بنا دیا۔ اس طرح ابلیس کی بجائے ملٹن نے ایک دوسرے خدا کی تخلیق کی۔ اقبال نے یہ غلطی نہیں کی۔ انھوں نے صرف باغی خدا لیکن حریفِ انسان کی تصویر کسی کی فکر کے اس فرق نے فن کا فرق بھی پیدا کیا ہے جو اصناف شاعری کے اختلاف میں رونما ہوا۔ ملک حسن اختر اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> "اقبال کا ابلیس قوت و شوکت مین ملٹن کے ابلیس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ملٹن کا ابلیس بھی جاہ و جلال اور شان و شوکت کا سرچشمہ ہے وہ جب اُٹھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ طوفان آ گئے ہیں اور جب چلتا ہے تو زمین و آسمان تھراتے ہیں۔ وہ خدا کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت کی غلامی سے دوزخ کی حکمرانی بہتر ہے۔ اقبال کا ابلیس بھی دل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ اگر ابلیس اپنی طاقت اور شان و شوکت کھو دے تو اقبال کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ رہے۔" ۲۲

اقبال کے نزدیک ایسے دشمن سے لڑائی میں اگر انسان ہار بھی جائے تو کوئی پروا نہیں۔ کیوں کہ حریف کم تر اور ناتواں نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں ابلیس کا مقصدِ حیات ابلیسی نظام کا فروغ نیز مستقبل میں اس کا استحکام ہے۔ لیکن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر نظامِ ابلیسی کے سامنے کچھ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ سو وہ ان مسائل کے حل کے لیے اپنے مشیروں سے مشورہ کرتا ہے۔ ابلیس اپنے نظام کے بارے میں اتنا پر اعتماد ہے کہ اندازِ گفتگو میں ادعا پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ ادعائی کیفیت ہی کسی اندرونی اضطراب کی پیچیدگی احوال کی غماز ہے۔ ابلیسی نظام کی نہ تو کوئی مستقل طاقت ہے نہ اس کا کوئی مثبت کردار ہے۔ بلکہ اس کا سارا اعتماد و انحصار انسان کی کمزوریوں پر ہے۔ جن کا استعمال کر کے ابلیس دنیائے انسانیت کی تخریب کرتا ہے۔ اقبال ابلیس کی خصوصیات کو سراہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ حالتِ فراق میں رہتا ہے اور خود اقبال بھی وصل سے زیادہ فراق کے داعی ہیں۔ چونکہ فراق میں ایک عمل، کوشش اور تحریک کارفرما ہے۔ اسی طرح اقبال جستجو اور آرزو کی بات کرتے ہیں۔ اقبال کے پیام میں جو رجائیت اور ان کی شاعری میں جو نشاط فن ہے اس کی حسین ترین ترجمانی لفظ "آرزو" اور آرزو کا پیکر قرار دیا ہے۔ اور اقبال کا فلسفہ زندگی بھی درد و داغ و سوز و سازِ آرزو سے وجود میں آتا ہے۔ ابلیس ایک عاشق کی طرح ہمیشہ حالت فراق میں رہ کر تگ و دو کرتا ہے۔ اس لیے اقبال نے اسے اس درجہ بلند مقام عطا کیا کہ اس کی زبان سے زندگی کے رموز بیان کیے۔ اقبال کو ابلیس سے ہمدردی ہے انھوں نے اس کے لیے بیچارہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمؑ اور ابلیس کا جرم نافرمانی تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ابلیس اور اولادِ آدم مل کر اس دنیا کو بہشت بناتے ہیں تاکہ بہشت سے نکالے جانے کا غم غلط ہو سکے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان ابلیس کے ساتھ برسرِپیکار رہے تاکہ اس کی صلاحیتیں جلا پا سکیں اور اس کی خودی مضبوط ہو سکے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ابلیس کے کہنے پر نہ چلے بلکہ اس سے جنگ کر کے اس کو اپنے قابو میں کرے۔ یوں مردِ مومن اس شر کی قوت کو تسخیر کر کے اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

عام مفہوم میں سوشلزم کمیونزم ہی کا دوسرا نام ہے مگر صحیح یہ ہے کہ سوشلزم کمیونزم کی ابتدائی صورت ہے۔ کمیونزم آئیڈیل ہے۔ اشتراکیت آغاز میں ایک اقتصادی یا معاشی نظریہ اور حصول حقوق کے لیے لائحہ عمل تھا لیکن کارل مارکس، اس کے رفقا اور دیگر اہلِ فکر نے اس کی تعمیر مضبوط کرنے کے لیے حیات و کائنات کی ایک ہمہ گیر نظریاتی اساس قائم کر دی جس سے اشتراکیوں کے نزدیک پہلے تمام ادیان اور فلسفوں کو منسوخ کر کے ان کی جگہ لے لی۔ اس نظریہ حیات نے دین اور اخلاق کے متعلق یہ عقیدہ پیش کیا کہ تمام پہلی تہذیبوں اور تمدنوں کا قیام طبقاتی تفوق کا رہین منت تھا اور دینی تعلیم کا زیادہ مصرف یہ تھا کہ استحصال بالجبر پر الٰہیاتی مہر لگا کر محتاجوں کو اس پر راضی کرے کہ وہ خوشی سے اس کو قبول کر لیں۔ منعموں سے کچھ رشک و حسد نہ برتیں۔ کیونکہ یہ دنیا چند روزہ اور اس کی نعمتیں ناپائدار ہیں۔ آخرت میں ابدی جنت اور اس کی مسرتیں سب ان محتاجوں کے لیے وقف ہیں جنھیں اس دنیائے دوں میں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اخلاق میں صبر و قناعت، توکل اور تسلیم و رضا کو اعلیٰ اخلاق اور روحانی اقدار قرار دے کر سلاطین اور امراء کے لیے حفاظت کا سامان پیدا کر دیا۔ اشتراکیت نے تاریخ عالم پر نظر ڈال کر اس کا ثبوت پیش کیا کہ مذہبی پیشوا اکثر و بیشتر حکومتوں کے آلہ کار رہے ہیں۔

اقبال کے نزدیک سوشلزم میں حق و باطل کی آمیزش ہے۔ اقبال کے کلام میں اشتراکیت کے حق میں بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ اسی لیے اکثر لوگ اقبال کو سوشلسٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اگرچہ انھیں سوشلسٹ تو نہیں سمجھتے لیکن اشراکیت کا حامی ضرور خیال کرتے ہیں اور حقیقت حال یہ ہے کہ اقبال تو صرف مزدور کا حامی ہے اور وہ سرمایہ دارانہ ناانصافیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے مزدور کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کی خوب صورت چالوں کو سمجھے اور اپنے حق کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ وہ اپنی نظم ''خضرِ راہ'' میں مزدور کی حمایت میں سرمایہ دار کی مذمت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

اقبال اپنی اس نظم میں جہاں سرمایہ دار کی شاخ نبات کا ذکر کرتے ہیں اسی بلیغ پیرائے میں مزدور کی محکومی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی لیے بادی النظر میں لوگ اقبال کو سوشلسٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اقبال جس طرح باقی تخیلات میں مستقل راہ اور رجحان رکھتا ہے اسی طرح اس معاملے میں وہ ان مسائل کو اپنے خاص نصب العین کے معیار پر پرکھتا ہے۔ اقبال سوشلزم کی جن باتوں کی حمایت کرتے ہیں ان میں سرفہرست سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت ہے۔ اقبال سمجھنے لگے تھے کہ سرمایہ دار طبقہ جن حربوں سے مزدوروں کو اپنا غلام رکھنا چاہتا ہے، اب اس کو مزید کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی کیونکہ اب محنت کش بیدار ہو رہے ہیں۔ اس احساس پر مشتمل ان کی متعدد نظمیں ہیں۔ اقبال نے سرمایہ داری اور اس کے توسط سے مغربی تہذیب کی مخالفت کرنے پر لینن کی تعریف و تحسین بھی کی۔ لیکن جیسے روسی انقلاب کی تفصیلات عام ہوئیں اور سوشلزم کی اصل تصویر سامنے آئی۔ اقبال سوشلزم سے بھی اسی طرح متنفر ہوتے گئے جس طرح وہ سرمایہ داری اور ملوکیت سے تھے۔ اسی ضمن میں ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ''سوشلزم پر ان کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے دین کو چھوڑ دیا ہے اور اس لیے ان میں قاہری تو ہے دلبری موجود نہیں ہے......اس وقت دنیا میں یہی دو نظام ہیں۔ یعنی سرمایہ داری اور سوشلزم جن پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر دونوں انسانیت کو برباد کر دیں گے۔ یہ دو پتھر ہیں جن کے درمیان انسان شیشے کی طرح پس رہا ہے۔'' ۲۳

Vol. 7 No.1 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

اقبال کے خیال میں روسی اشتراکیت یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرضانہ سرمایہ داری کے خلاف ایک ردِّ عمل تھی لیکن ان کے نزدیک مغرب کی سرمایہ داری اور روسی اشتراکیت دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ تھیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا درس پیغمبر اسلام ﷺ نے دیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اقبال کو افسوس تھا کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ معلوم ہوتا کہ اس اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ اقبال کو یہ یقین تھا کہ عہد جدید کا شعور ملوکیت اور اشتراکیت میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دے گا اور خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ چنانچہ اقبال نے خود اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ روس کے اشتراکی نظام میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھی۔ اس حوالے سے ملک حسن اختر لکھتے ہیں :

> ’’ملوکیت کی روح سرمایہ داری جمہوریت اور سوشلزم دونوں میں ہے۔ مگر ایک تیسرا نظام بھی ہے جو اقبال کے نزدیک پسندیدہ ہے اور دونوں کی خامیں سے پاک ہے اور وہ ہے اسلام کا نظام۔ مسلمان ممالک کی تعداد تو بہت زیادہ ہے مگر کسی میں بھی اسلامی نظام رائج نہیں۔ دراصل مسلمانوں نے قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر وہ جدید زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کا مطالعہ کریں تو وہ دیکھیں گے کہ اس کتاب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اشتراکیت کے سارے اقتصادی اصول موجود ہیں مگر اس کی خامیوں سے پاک ہیں۔‘‘ ۲۴

بحث سمیٹتے ہوئے ملک حسن اختر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت جائز ہے یا نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اقبال نے کس طرح اُن امراض کا ذکر کیا جن کا امت مسلمہ شکار ہے۔ اور پھر ان امراض کا علاج بھی بتا دیا۔ جو بحیثیت قوم مسلمانوں کی ملت کو کمزور کر رہے ہیں۔ ایک انتہائی خوبصورت بات جو ایک نادر خیال ہے جو ملک حسن اختر نے پیش کیا ہے جو شاید اس سے پہلے اس انداز میں کسی نے بیان نہیں کیا۔ آپ لکھتے ہیں کہ :

> ’’سوشلزم کو مارنے کے بجائے اسے مسلمان کر لینا چاہیے۔‘‘ ۲۵

بہر کیف اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سوشلزم کی خامیوں کو قرآن کی روشنی میں دور کر کے اپنایا جا سکتا ہے۔ اور جب سوشلزم کی خامیاں ہی دور ہو جائیں گی تو یقیناً جو اصول و قوانین باقی بچیں گے وہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں گے۔ یوں سوشلزم کو مسلمان کر کے اپنایا جا سکتا ہے۔

اقبال صرف نظم کا شاعر نہیں بلکہ اُن کی غزل بھی اپنی مثال آپ ہے۔ فارسی اور اردو شاعروں نے غزل کو عشق و محبت کے معاملات کے لیے مخصوص کر دیا۔ حالی تک آتے آتے غزل اپنی روایتی ہیئت اور موضوعات برقرار رکھے ہوئے تھی۔ غزلوں کے موضوع کی یکسانیت کی بنا پر ہر شاعر کی غزلیات صرف عشق و محبت کے معاملات ہی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ حالی نے اس صورت، حال میں ایک نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی تھی اس پر قصرِ رفیع الشان بنانے کا کام اقبال کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔

اسلوب کے لحاظ سے اقبال کی اردو شاعری کئی مراحل سے گزرتی ہے۔ پہلا مرحلہ جس کے نشانات ’’بانگ درا‘‘ کے حصہ اول و دوم میں ہیں دراصل روحانی آشفتگی اور متصوفانہ افسردگی کا دور ہے۔ اس میں شاعر مغرب کے رومانی فطرت پسند شاعروں کے انداز میں اپنے ماحول کے استعارات و تشبیہات اور علامتوں سے کام لے کر جذبات اور مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے۔ دوسرا مرحلہ جس میں شاعر فلسفیانہ تجزیے کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ چوتھا ضرب کلیم کے اسلوب میں ہے۔ جس میں شاعر سادہ بیانی سے کام لے کر حقائق کا اظہار سادہ اور بے تکلف زبان میں کرتا ہے۔ ’’زبورِ عجم‘‘ کو اس لحاظ سے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ وہ فارسی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ شعریت اور تغزل کا بھرپور

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

رچاؤسب سے زیادہ ''زبورِ عجم''میں پایا جاتا ہے۔اقبال مفکر تھے،ان کا فلسفہ طلسم افلاطون کی طرح خیالی نہیں بلکہ اس کی اساس،زندگی کے حقائق پر مبنی ہے۔انھوں نے زندگی کے اہم ترین مسائل پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک مستقل نظام فکر مرتب کیااوراس طرح حیات وکائنات کی لا محدود وسعتوں سے غزل کو ہمکنار کر دیا۔اقبال کی غزلوں میں قوت اور توانائی اور لہجے کی تیزی کا جو احساس ہوتا ہے وہ وہ غزل کے لیے ایک بالکل نئی چیز ہے۔

''اقبال اور ہم'' مضمون یومِ اقبال کے موقع پر لکھا گیا۔یہ دراصل ایک تقریر ہے۔اس لیے اس کے اختتام پر لکھا ہوا ہے کہ (یہ تقریر یوم اقبال کے موقع پر پڑھی گئی)۔اس مضمون میں یوم اقبال کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔اقبال کی خدمات بیان کی گئی ہیں اور مسلمانوں کو اور خصوصاً پاکستان کے مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلائے گئے ہیں۔اس مضمون کی حیثیت علمی نہیں بلکہ تاثراتی ہے اوراس میں اقبال کے پیغام کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

''اطرافِ اقبال'' کے آخری حصے میں ملک حسن اختر نے اقبال کے دورِ اولین کی طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ان نظموں کی اس طرح تشریح وتوضیح کی گئی ہے جس سے فکر اقبال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اقبال کے فلسفہ اور فکر کو سمجھنے کی کوشش ہر دور میں کی گئی ہے۔اس کوشش کے نتیجے میں فکرِ اقبال کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں اور نئے در وا ہوتے ہیں۔ نظم ''ایک آرزو'' وہ پہلی نظم ہے جس پر ملک حسن اختر نے اظہار خیال کیا ہے:

> ''ہر شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس کے کلام کی خصوصیات تک رسائی حاصل کر سکیں۔اس کے لیے ہم کو اس کے ہر شعر، ہر غزل اور نظم کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔تب گوہر مقصود ہاتھ لگتا ہے۔ یہ بات بہت کم شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے کہ ان کی ایک نظم ان کے کسی خاص دور یا ان کی تمام خصوصیات کلام کی حامل ہو۔اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام کے ہر دور کی امتیاز کی خصوصیات اس کی اس دور کی ایک مخصوص نظم میں نظر آتی ہیں۔چنانچہ ان کے دورِ اولین کی نمایاں خصوصیات کی طرف ان کی نظم ''ایک آرزو'' واضح اشارہ ہے۔''۲۶

علامہ اقبال کے اس دور کے کلام میں مناظر فطرت کے ساتھ جذباتی وابستگی،حبِ وطن اوراس کے نتیجہ میں اپنے ہم وطنوں کی خدمت اور اہلِ وطن کے لیے درد مند دل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔اقبال عالم انسانی کے شاعر ہیں وہ جو کچھ سوچتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اسے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔اقبال کے یہ جذبات واحساسات ان کی شاعری میں اس انداز سے نظر آتے ہیں کہ ان کی شخصیت کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔یہ وہ نظم ہے جس میں بانگ درا کے دور کی تمام خصوصیات یکجا ہو گئی ہیں۔اقبال چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے شور و غل سے دور کسی الگ تنہا مقام پر چلے جائیں جہاں ارد گرد صرف دلفریب مناظر ہوں اور ان حسین مناظر شاعر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کھو جائے اور پھر تشبیہات واستعارات کی مدد سے ان مناظر، فطرت کو شاعر بیان کرتا ہے تاکہ پڑھنے والا بھی محظوظ ہو۔اقبال خامشی پر مرتے ہیں اوراسی خامشی میں وہ اپنا ایک چھوٹا سا مسکن بنانا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد ملک حسن اختر جس نظم کا تجزیہ کرتے ہیں وہ ''خضرِ راہ'' ہے۔اسکا آغاز منظر نگاری سے ہوتا ہے۔یہ منظر نگاری بھی در حقیقت ایک پس منظر ہے،ایک خاص کردار کے ظہور کے لیے اوراس کی معروف خصوصیت کے مطابق خواجہ خضر دو باتوں کے لیے مشہور ہیں۔اول یہ کہ ان کی جولان گاہ سطح آب ہے جس پر یا جس کے گرد وہ دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر سیر کرتے رہتے ہیں۔وہ بہت باخبر اور صاحبِ علم ہیں،اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں پر بہت سی اشیا اور واقعات کے وہ حقائق و مصالح روشن کر دیے ہیں جو عام انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔چنانچہ ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

> ''اقبال ہمیشہ مسلمانوں کے مستقبل سے پُر امید رہے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی دن ضرور دین کے حصار میں داخل ہوں گے کیونکہ یہ ذرا کم کوش ہیں بے ذوق نہیں ہیں۔اس کشتِ ویراں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوتے۔اس کی زرخیز مٹی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.1 2024

ضرور کسی دن نم حاصل کر کے بہار کا سماں پیدا کرے گی۔ چنانچہ آخر میں حضرت خضر پیش گوئی کرتے ہیں کہ اسلام ایک بار پھر سربلند ہوگا۔'' ۲۷

یوں یہ نظم رجائیت اور اُمید لیے اختتام کو پہنچتی ہے اور یہی وہ امید ہے جو اقبال ایک غلام اور ذہنی طور پر لاغر قوم کو دلانا چاہتے تھے جو اس وقت کی ضرورت تھی۔

ملک حسن اختر نے ''خضرِ راہ'' کے بعد ''طلوعِ اسلام'' اور ''ساقی نامہ'' کا تجزیہ کیا ہے۔''ساقی نامہ'' کو اقبال کے کلام کا ماحصل قرار دیا جاتا ہے۔ جہاں خضرِ راہ'' ختم ہوتی ہے نظم ''طلوعِ اسلام'' کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے۔ اس میں نو بند ہیں۔ ہر بند میں آٹھ شعر لکھے گئے ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے فارسی تراکیب سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے زبان مشکل ہوگئی ہے۔ نظم کے شروع میں مسلمانوں کی بیداری کا ذکر ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک مکمل نظم ہے۔ عصرِ حاضر میں دنیائے اسلام کے اس غروب کے بعد جس کا مرقع ''خضرِ راہ'' میں کھینچا گیا تھا، طلوعِ اسلام کے مضمون پر اقبال نے اس کے ان تمام مضمرات و نکات کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ جو مشرق و مغرب کے تصادم، قدیم وجدید کے تضاد اور دین و دنیا کے تقابل سے پیدا ہوئے ہیں۔ مغرب کو مشرق کے سامنے ایک فریق سے زیادہ ایک مریض کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب نظم کا موضوع طلوع اسلام ہے تو لازمانی اعتبار سے مضمون تخلیق اسلام ہونا ہی چاہیے تھا۔ ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

''چونکہ ملتِ اسلامیہ سے خطاب ہے، اس لیے وہ انھیں پھر یاد دلاتے ہیں کہ خودی کی حفاظت اتحاد سے ہی ہو سکتی ہے۔'' ۲۸

اس نظم میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ حسن اختر صرف موضوعاتی پہلوؤں کو ہی نہیں بلکہ ہیئتی حوالے سے بھی اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ نظم ''ہزج مثمن'' میں ہے اس لیے اس میں غنایت اور غزلیہ آہنگ پایا جاتا ہے۔ الغرض ملک حسن اختر کی یہ تصنیف علامہ اقبالؒ کے بنیادی فلسفیوں یعنی خودی و بے خودی، عشق، مردِ مومن، نظریۂ فن، تصور تعلیم اور تصورِ ابلیس پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، اطرافِ اقبال، پیش لفظ، لاہور نمبر ۲، مکتبہ میری لائبریری، ص ۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۰

۳۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، دائرہ معارف اقبال، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء، ص ۲۰۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۵۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، معارفِ اقبال، لاہور، مکتبہ میری لائبریری نمبر ۲، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۷

۶۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، اطرافِ اقبال، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۲ء، ص ۱۵۶

۷۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، معارفِ اقبال، ص ۳۲۱

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۱۵، ۲۱۴

۱۲۔ عبدالمغنی، اقبال کا نظامِ فن، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۳۶

۱۳۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، اطرافِ اقبال، ص ۲۳۴

Vol. 7 No.1 2024

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7615

۱۴۔ایضاً،ص۲۲۵،۲۲۶

۱۵۔حسن اختر،ملک،ڈاکٹر،دائرہ معارف اقبال،ص۱۳۰

۱۶۔ایضاً،ص۲۵

۱۷۔حسن اختر،ملک،ڈاکٹر اطرافِ اقبال،ص۲۴۱

۱۸۔ایضاً،ص۲۷۷

۱۹۔ایضاً،ص۲۷۷

۲۰۔ایضاً،ص۲۸۰

۲۱۔ایضاً،ص۲۹۸

۲۲۔ایضاً،ص۳۲۰

۲۳۔ایضاً،ص۳۲۶